دعوتِ اسلامی کے مطالبات

اپنے کارکنوں سے

مولانا صدرالدین اصلاحی

دنیا کی ہر تحریک اپنا ایک خاص نصب العین، ایک متعین منزلِ مقصود اور ایک آخری ہدف رکھتی ہے اور جس نوعیت کا یہ نصب العین ہوتا ہے اسی نوعیت کی فکری اور عملی صفات رکھنے والے کارکن بھی اُسے درکار ہوتے ہیں۔ یہ کارکن کسی بھی تحریک کی اوّلین ضرورت ہوا کرتے ہیں کیونکہ تحریکوں کی کامیابی جن باتوں پر موقوف ہوا کرتی ہے ان میں سب سے پہلا مقام ایسے ہی کارکنوں اور ان کی انہی صفات کو حاصل ہے۔ واضح تر لفظوں میں یہ کہ اپنے کارکنوں کی یہی صفات تحریک کا اصل سرمایہ ہوا کرتی ہیں۔ اچھی سے اچھی تحریکیں بھی کس مپرسی اور نامرادی کا شکار ہو کر دم توڑ دیا کرتی ہیں اگر ان کے پاس حیات و بقا کا یہ سرمایہ موجود نہ ہو اور نامعقول سے نامعقول تحریکیں بھی قوموں اور مملکتوں کو مسخر کر لیتی ہیں اگر ان کے علمبردار اور کارکن ضروری صفات اور صلاحیتوں سے مسلح ہوں۔ جہاں تک دینی دعوتوں اور اسلامی تحریکوں کا تعلق ہے معلوم رہنا چاہیے کہ یہ اصول یا یہ قانونِ قدرت ان کے احترام میں کچھ نرم نہیں پڑ جاتا بلکہ شاید کچھ اور سخت ہی ہو جاتا ہے۔ اُن کے لیے زندگی اور کامیابی کی راہیں اُسی وقت ہموار ہو سکتی ہیں جب ان کے کارکن فکر و عمل کے ایک خاص سانچے میں پوری طرح ڈھلے ہوئے ہوں۔ کسی اسلامی تحریک کے ارد گرد لوگوں کی کتنی ہی بڑی بھیڑ کیوں نہ اکٹھی ہو جائے لیکن ان کے پاس اگر وہ نگاہ نہ ہو جو ایک داعیِ حق کی نگاہ ہوتی ہے، نہ وہ دل ہو جو ایک سچے مومن کے سینے میں پایا جاتا ہے تو یہ جمِّ غفیر اس کے لیے کسی خیر کا موجب ہرگز نہیں بن سکتا ہے۔ ایسی تحریکوں کا مقدر یا تو سسک کر دم توڑ دینا ہوتا ہے یا ایسی وادیوں میں جا بھٹکنا جن میں سے ہو کر گزرنے والی کوئی راہ بھی احیائے اسلام اور اقامتِ دین کی منزل تک پہنچانے والی نہیں ہوتی۔

جس چیز کی اتنی اہمیت ہو، جس کے وجود اور عدم کے معنی تحریکوں کی زندگی اور موت کے ہوں اُس کے بارے میں یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ اُسے پوری طرح واضح اور اس کی اہمیت سے اچھی طرح واقف اور آگاہ رہنا چاہیے۔ آیئے ہم جائزہ لے کر دیکھیں کہ وہ صفات کون سی ہیں جن پر کسی فرد کا داعیٔ حق ہونا اور کسی اسلامی تحریک کا کامیاب ہونا موقوف ہے۔

اس سوال کا چند لفظی جواب تو یہ ہے کہ یہ صفات بلاکم وکاست وہی ہیں جو ایک سچے مسلمان اور قرآن کے مردِ مومن میں پائی جاتی چاہییں۔ ان صفات کی پوری تفصیلات خدا کی کتاب اور رسولِ خدا کے ارشادات میں موجود ہیں اور ان کی عملی شرح اُن داعیانِ حق کا عمل کرتا ہے جنہیں دنیا حواریین اور اصحابِ رسولؐ کے نام سے جانتی ہے۔ ان صفات کی تفصیل چونکہ کافی طویل ہے اور ان سب کی تفصیل کے لیے پورا ایک دفتر بھی کفایت نہیں کر سکتا، اس لیے اس مختصر مضمون میں صرف چند منتخب اور بنیادی صفات ہی پر روشنی ڈالی جا سکتی ہے۔ لیکن یہ منتخب صفات ایسی ہوں گی جو نہ صرف یہ کہ بجائے خود بنیادی اور غیر معمولی اہمیت کی مالک ہیں بلکہ باقی دوسری صفات کے لیے بھی سرچشمۂ حیات کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس لیے ان چند صفات کی وضاحت اور یاددہانی یقیناً اُن ساری صفتوں کی وضاحت اور یاددہانی کی ہم معنی ہوں گی جن کا مطالبہ دعوتِ اسلامی اپنے کارکنوں سے کرتی ہے

ان بنیادی اور غیر معمولی طور پر اہم صفات میں سے کچھ کا تعلق تو فکر و نظر سے ہے اور کچھ کا سیرت و کردار سے۔ یہاں مناسب ہوگا کہ پہلے ان صفات کو لیا جائے جو فکری نوعیت کی ہیں۔

نصب العین کا یقین پہلی صفت جس کا دعوتِ اسلامی کے علمبرداروں اور کارکنوں میں پایا جانا از بس ضروری ہے، اپنے نصب العین کے بارے میں ذہن کی مکمل یکسوئی اور قلب کا پورا اطمینان ہے۔ ایسی یکسوئی جسے حالات کا کوئی دباؤ درہم برہم نہ کر سکے اور ایسا اطمینان جو ہر آن تازہ و توانا رہے اور ماحول کی کوئی ترغیب اور وقت کی کوئی مصلحت اُسے متاثر نہ کر سکے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ کسی دعوت کو برحق اور اس کے نصب العین کو اپنا نصب العین تسلیم کر لینا اور بات ہے اور اُنہیں پورے شرحِ صدر کے ساتھ برابر تسلیم کیے رہنا بالکل دوسری بات ہے۔ کسی بھی ذہنی فیصلے اور قائم کیے ہوئے یقین کے بارے میں یہ اطمینان نہیں رکھا جا سکتا کہ اب وہ کبھی بے یقینی یا کم یقینی سے بدل نہ سکے گا۔ بلاشبہ انسان اللہ کے دین کی نصرت اور اقامت کو اپنا فریضۂ حیات قرار دینے کا فیصلہ پورے اخلاص اور عزم سے کرتا ہے مگر ساتھ ہی ایسے عوامل

بھی اس کی آنکھوں کے سامنے آتے ہیں جو اسے اس نصب العین کی طرف سے شک اور تردد میں مبتلا کر دینا چاہتے ہیں۔ ان کی اس کوشش کی کامیابی کے امکانات سب سے زیادہ اُس وقت ہوتے ہیں جب دعوت مسلسل بے توجہی اور نامقبولیت کے دَور سے گزر رہی ہو۔ اس کی آواز ماحول کے لیے یکسر نامانوس اور اس کے ماننے والے بس خال خال ہوں۔ اس حقیقت کا سراغ ہمیں خود قرآنی دعوت کی سرگذشت میں بھی ملتا ہے۔ قرآن مجید کی ان ہدایات کا غور سے جائزہ لیجیے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے توسط سے آپ کے اصحاب کو دی گئی تھیں:۔

”یہی حق ہے تمہارے رب کی جانب سے، پس تم ہرگز شک کرنے والوں میں سے نہ ہو جانا۔“

(البقرہ۔ ۱۴۳)

”پس اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اگر تمہیں اُس چیز کے بارے میں کوئی شک ہو جسے ہم نے تمہاری طرف نازل کیا ہے تو اس کے متعلق ان لوگوں سے پوچھ لو جو تم سے پہلے سے کتاب الٰہی پڑھتے رہے ہیں۔ یقیناً یہ حق تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے آیا ہے تو تم ہرگز شک کرنے والوں میں سے نہ ہونا“ (یونس - ۹۴)

ان ہدایات اور تنبیہات کے پس منظر میں واضح طور پر ردّ و انکار بھری وہ فضا تھی جو دعوتِ قرآنی پر ایک مدت تک چھائی رہی تھی۔ یہ ہدایات بتاتی ہیں کہ اگر سورج جیسی روشن حقیقت کا بھی ہر طرف سے انکار کیا جا رہا ہو اور اس انکار میں عوام و خواص، اپنے اور بیگانے، واقف اور ناواقف سبھی شریک ہوں تو آدمی کو بسا اوقات خود اپنی آنکھوں پر شبہ ہوتا ہے۔ حضرات صحابہ کرام کو یہ ہدایتیں ایسے ہی حالات میں اور انسانی نفسیات کے اِسی پہلو کے پیشِ نظر دی گئی تھیں۔ سوچنے کی بات ہے کہ جب اصحاب کرام جیسے ایمان و یقین کے پیکر بھی اس امکان سے یکسر بالاتر نہ تھے کہ فضا کی تاریکی ان پر شک و تردد کی پرچھائیاں ڈال دے، حالانکہ وحی الٰہی کے انوار وہ براہ راست اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے، تو آج ایمان و یقین کے اس دورِ زوال میں اِس امکانی اندیشہ سے کیسے محفوظ رہا جا سکتا ہے۔ صورتِ حال اس وقت یہ ہے کہ مغرب کی مادی تہذیب پوری قوت کے ساتھ دنیا پر مسلّط ہے۔ انسانیت کا قافلہ چار و ناچار اسی کی قیادت میں سفر کر رہا ہے اور اسی کے بطن سے نکلے ہوئے نظام مغرب اور مشرق میں ہر طرف قبولِ عام حاصل کیے ہوئے ہیں۔ دوسری طرف اسلام کے پیروؤں کا اپنا حال بالعموم یہ ہے کہ ان کے لیے وہ دین نظری

طور پر بھی پوری طرح مانوس نہیں رہ گیا ہے جس کی وضاحت خدا کی کتاب اور رسولِ خدا کی سنت کرتی ہے اور جہاں تک عمل و اتباع کا، اس دین کی مکمل پیروی اور اقامت کا سوال ہے اسے تو گویا بڑی حد تک عملاً فراموش ہی کر دیا گیا ہے اور اگر کہیں اس کا احساس کروٹ لیتا بھی ہے تو خوشنما تاویلات اور رنگارنگ توجیہات کا سحر اسے پھر گہری نیند سلا دیتا ہے حتیٰ کہ اس طرح کے اقدامات کو عاقبت نااندیشی اور بے دانشی ٹھیرا دینے میں بھی تامل نہیں کیا جاتا۔ ایسے ناسازگار اور حوصلہ شکن حالات میں دعوت اسلامی کے نصب العین پر اپنے یقین کی شمع کو روشن رکھنا کوئی آسان بات نہیں۔ یہ دراصل طوفانی سمندر میں اپنے حواس کو مجتمع رکھنے اور اپنی چھوٹی سی کشتی کو موجوں اور چٹانوں سے محفوظ بچا لے جانے کی مردافگن مہم ہے۔ دعوت اسلامی کے ہر کارکن کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس مہم سے آگاہ بھی رہے اور اسے کامیابی سے سر کرنے کے لیے تیار بھی رہے۔

موقف کی استقامت دوسرا ضروری اور بنیادی وصف جس پر داعیانہ زندگی کی بقا موقوف ہے، فکر و نظر کی صلابت اور موقف کی استقامت ہے۔ دعوتِ اسلامی کا حق ادا اسی وقت ہو سکتا ہے جب اس کے علمبردار اس کے اصولوں میں کسی ترمیم اور کسر و انکسار کے بالکل روادار نہ ہوں، دین کی اقامت کی سیدھی شاہراہ پر قدم مضبوطی سے جمائے چل رہے ہوں اور اپنے موقف کے کھلے ہوئے تقاضوں کو زمانہ کی کسی ترغیب اور دعوتِ مصالحت پر قربان نہ کریں۔ اس سلسلہ میں اس ابدی حقیقت کو کبھی نہ بھولنا چاہیے کہ اس دین کا اور اس دعوت کا مزاج ہی مصالحت ناآشنا نہیں ہے بلکہ اس کی کامیابی کا انحصار بھی مصالحانہ رویہ سے یکسر گریز پر ہے۔ مصالحت سے میری مراد یہاں وہ مصالحت نہیں ہے جو ایمان کی کمزوری اور ہمت کی پستی، دنیا کی محبت اور مفادات کی کشش کا نتیجہ ہوا کرتی ہے کیونکہ ایسی دناءت کا اندیشہ دعوتِ حق کا علم اُٹھانے والوں سے رکھا ہی نہیں جا سکتا۔ ان کے بارے میں اندیشہ اگر کیا جا سکتا ہے تو صرف اُس مصالحت کا جو دنیا اور نفس کی خاطر نہیں بلکہ کم نظری کی بنا پر خود دعوتِ حق ہی کے مفاد کی خاطر کر لی جائے جس کی بنیاد نیت کے کھوٹ اور نفس کی اُکساہٹ پر نہیں بلکہ اپنے ارادے کی حد تک حسنِ نیت اور جذبۂ خیر ہی پر ہو۔ اس خطرے کا امکان اس وقت پیدا ہوتا ہے جب داعی کے ذہن میں یہ خیال گردش کرنے لگے کہ اگر دین و ایمان کے بے لچک اُصولوں میں اس وقت عارضی طور پر تھوڑی سی لچک پیدا کر لی جائے تو ایک طرف دعوت کے خلاف اُٹھنے والا طوفان ختم جائے گا۔ دوسری طرف دعوت کے لیے ترقی اور مقبولیت کی راہیں بھی کھل جائیں گی۔

جیسا کہ ابھی عرض کیا جا چکا ہے، یہ اندازِ فکر کسی مرعوب اور فراری ذہنیت کی پیداوار نہیں ہوتا، بلکہ اپنے شعور کی حد تک خود نصب العین ہی کے مفاد کی خاطر اختیار کر لیا جاتا ہے اور اس کا محرک اہلِ دعوت کی وہ حرص ہوتی ہے جسے وہ دعوت کے فروغ کے سلسلے میں فطری طور پر رکھتے ہیں۔ اس حرص کے غیر معمولی دباؤ میں جب ان کی فکری استقامت اور دُور بینی پر عجلت پسندی اپنا سایہ ڈال دیتی ہے تو سوچنے کا یہ انداز وجود میں آ جاتا ہے اور اس طرح خود خیر پسندی کے نام پر خیر کی حقیقی منزل کا سراغ گم ہونے لگتا ہے۔ شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ حق کی راہ مار دینے والے فتنوں میں یہ سب سے زیادہ خطرناک فتنہ ہے۔ یہ ایسا دامِ ہم رنگ زمین ہے جس سے محفوظ رہنا ایمان کی فراست اور فکر و نظر کی استقامت کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ بات اچھی طرح سمجھ میں آ جائے گی اگر کسی اور کی نہیں خود سیدالانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتی سرگزشتوں پر ایک نظر ڈال لی جائے۔ آپؐ کو اپنے مختلف دعوتی مراحل میں جن حالات سے سابقہ پیش آیا ان میں سے ایک خاص صورتِ حال کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا تبصرہ قرآن کے اندر ان لفظوں میں موجود ہے۔

> ” قریب تھا کہ یہ لوگ تمہیں فتنہ میں مبتلا کر کے اس ہدایت کی طرف سے پھیر دیں جس کی ہم نے تم پر وحی کی ہے تاکہ تم ہماری طرف اس کے سوا کچھ اور ہی باتیں منسوب کر دو۔ اس وقت یہ لوگ تمہیں اپنا گہرا دوست بنا لیتے اور اگر ہم تمہیں ثابت قدم نہ رکھتے تو کچھ نہ کچھ ان کی طرف تم ضرور جھک پڑے ہوتے۔“ (اسرا:)

اس تبصرہ کے الفاظ خود بتاتے ہیں کہ اس کا تعلق اسی طرح کی صورتِ حال سے تھا جو اِس وقت زیرِ بحث ہے۔ یہ وہ وقت تھا جب مخالف کیمپ کو محسوس ہو گیا تھا کہ اب کوئی بھی متشددانہ کارروائی اس دعوت کو آگے بڑھنے سے روک نہیں سکتی۔ اس وقت مخالفین نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ اپنا محاذِ جنگ بدل دینا چاہا، ظلم و تشدد کی جگہ صلح و مصالحت کی تدبیروں سے کام نکالنے کی کوشش کی، پیش کش کی گئی کہ اس دعوت کو تھوڑا سا معتدل بنا دیا جائے تو ہم بھی اپنی مخالفانہ سرگرمیاں بند کر دیں گے۔ اس پیش کش نے جیسا کہ ” لقد کدت ترکن الیہم شیئاً قلیلا “ کے الفاظ بتاتے ہیں، آپؐ کو ایک طرح کی اُلجھن میں مبتلا کر دیا۔ ایک طرف تو رسالت کی ذمہ داریوں کا تقاضا یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو کچھ بھی آیا ہے اُسے اس کے بندوں تک بلا کم و کاست پہنچا دیا جائے اور اس میں کسی بھی مصلحت کی خاطر ذرہ برابر ترمیم نہ کی جائے۔ دوسری طرف اپنی قوم کے ایمان کے بارے میں آپ کی حد سے بڑھی ہوئی تمنا تھی جس کی بنا پر آپؐ ہر اُس ممکن تدبیر اور مناسب موقع سے فائدہ اُٹھانے پر آمادہ رہا کرتے تھے جس سے اس

پاک آرزو کے برآنے کی توقع ہوتی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی اس پیش کش سے آپ یک گونہ تردّد میں پڑ گئے اور یہ محض اللہ کی غیبی حفاظت تھی جس نے آپؐ کو اس تردّدِ محض کی حالت سے آگے نہ بڑھنے دیا اور آپ کے قدموں کو حق کے موقف پر مضبوطی سے جمائے رکھا۔

خیر نما شر

سوچیے اور بار بار سوچیے کہ خیر کا جامہ پہن کر نمودار ہونے والا یہ شر کتنا خطرناک ہے اور ہم جیسے کمزور انسانوں کو اس کے حملے سے بچے رہنے کے لیے کتنی ہوشمندی اور کتنی دعاؤں کی ضرورت ہے؟ اگر اللہ تعالیٰ کی توفیق اور حفاظت کے بغیر پیغمبر کے لیے اس کے بچھائے ہوئے جال سے دھوکا کھا جانے کا امکان ہو سکتا تھا تو آج ہم اس کی طرف سے بے فکر اور مطمئن کیسے رہ سکتے ہیں۔ پس دعوت اور اس کے کارکن اس امر کے سخت محتاج ہیں اور برابر رہیں گے کہ ان کے دل و دماغ اس خیر نما شر سے اپنے آپ کو بچائے رکھنے کا پورا اہتمام رکھیں اور ان کے موقف میں کوئی کمزوری نہ آنے پائے۔

اس اہم انسانی صفت کی کیفیتِ مطلوب جس کی اس وقت یاد دہانی کرائی جا رہی ہے، پوری طرح سمجھ میں آ جائے گی اگر دعوتِ محمدی کے ایک ناقابلِ فراموش واقعہ کو سامنے رکھ لیں جو مکّی دور میں پیش آیا تھا۔ قریش نے ابوطالب کے توسط سے آپ کے سامنے یہ مصالحانہ پیش کش رکھی کہ آپ اپنے دین اور اپنے عقیدۂ توحید کی تبلیغ جس طرح چاہیں کرتے رہیں مگر ہمارے عقائد کی تردید سے صرفِ نظر کر لیں، ہم آپ کے قدموں میں دولت کا انبار ہی نہیں لگا دیں گے بلکہ اپنا حکمران بھی تسلیم کر لیں گے۔ کوئی شبہ نہیں کہ ایک عام انسان کے نقطۂ نگاہ سے یہ پیش کش انتہائی پرکشش تھی۔ وہ اسے کسی ذاتی مفاد کی خاطر نہیں بلکہ عین اپنی دعوت کے مفاد کے لیے ایک خداداد موقع سمجھ سکتا تھا۔ مصلحت شناسی اسے سمجھا سکتی تھی کہ اس ملنے والے اقتدار سے کام لے کر میں اپنی دعوت کو بڑی آسانی اور تیزی کے ساتھ آگے بڑھا سکوں گا اور یہ سوچ کر وہ اس پیش کش کو لپک کر قبول کر لیتا۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ اس پیش کش کے جواب میں آنحضرتؐ نے کیا فرمایا؟ یہ فرمایا کہ "خدا کی قسم اگر یہ لوگ میرے داہنے ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند لا کر رکھ دیں جب بھی میں اپنی دعوت اور دعوتی سرگرمیوں سے باز نہ آؤں گا" ہمارا ایمان ہے کہ یہ جواب جوش اور تمکنت کا جواب نہ تھا بلکہ پیغمبرانہ بصیرت کا جواب تھا۔ اس حقیقت شناسی کا جواب تھا کہ حق کی دعوت اگر صرف ایجابی پہلو تک محدود رکھی گئی تو وہ اپنی اصل معنویت برقرار نہ رکھ سکے گی اور باطل سے مصالحت کرنا دراصل اپنی دعوت کے قتل نامے پر دستخط کر دینا ہے۔

ضرورت ہے کہ دعوت کے علمبردار اس سبق کو بھی ہمیشہ یاد رکھیں جو قریش کی اس پیش کش سے ملتا ہے اور حق کی فطرت کے اس تقاضے کو بھی ذہن نشین رکھیں جو اللہ کے رسولؐ کے اس جواب سے واضح ہوتا ہے۔

آج کے حالات میں اس عزم و احتیاط کی ضرورت کچھ کم نہیں ہو گئی ہے بلکہ کچھ بڑھ ہی گئی ہے کیونکہ اب ان کی نوعیت بڑی پیچیدگی اختیار کر گئی ہے۔ دورِ نبوت میں معاملہ اسلام کے کھلے ہوئے منکروں اور مخالفوں سے تھا مگر آج سابقہ غیروں اور اپنوں سبھی سے ہے۔ مخالفوں کی دعوتِ مخالفت کا بھانپ لینا پھر بھی آسان ہوتا ہے مگر اپنوں کے مصالحانہ مطالبات سے عہدہ برآ ہونا بڑا مشکل اور نازک مسئلہ ہے۔

آج فکر و عمل کے متعدد دھارے بہہ رہے ہیں۔ کوئی وطنی ہے کوئی قومی، کوئی ملّی ہے اور کوئی تہذیبی اور معاشی۔ اور ان میں سے ہر ایک چاہتا ہے کہ سب اس میں آشامل ہوں۔ یہ مختلف دھارے دوسروں کی طرح دعوتِ اسلامی اور اس کے کارکنوں سے بھی انضمام کا یہ مطالبہ کر سکتے ہیں اور بسا اوقات بڑے مؤثر دلائل کے ساتھ کر سکتے ہیں۔ اُن کی ایمانی فراست اور فکری استقامت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ ایسے وقت میں اپنے موقف پر کوئی حرف نہ آنے دیں۔ اُن کے موقف کا تقاضا ان مقبولِ عام دھاروں میں خود بھی جا شامل ہونا نہیں ہے بلکہ اُن کے رُخ کو موڑ دینا ہے۔ یہ صرف دعوتی رُوح کا ہی تقاضا نہیں ہے بلکہ خود ملک اور ملّت کے ساتھ سچی وفاداری اور حقیقی بہی خواہی کا بھی یہی تقاضا ہے۔

صبر اور مستقل مزاجی تیسری اہم صفت صبر اور مستقل مزاجی کی ہے۔ داعی کے قلب کو اتنا مضبوط ہونا چاہیے کہ حالات کی کوئی ناسازگاری اس کے عزم کو مفلوج نہ کر سکے۔ یہ ناسازگاریاں بنیادی طور پر دو قسم کی ہوتی ہیں۔ پہلی قسم میں وہ مشکلات اور مصائب شامل ہیں جو دعوتی فریضہ کی انجام دہی کی وجہ سے پیش آئیں۔ دوسری قسم اس ناسازگاری کی ہے جو دعوت کی ظاہری ناکامی کی شکل میں سامنے آئے۔

جہاں تک مصائب و مشکلات کا تعلق ہے، ان کا راہِ حق میں پیش آنا اللہ کے قانونِ آزمائش نے ہمیشہ سے مقدر کر رکھا ہے اور ان سے کترا کر نکل جانا کسی مخلص داعی گروہ یا فرد کے لیے ممکن ہی نہیں۔ اللہ کے اس قانونِ آزمائش کے پیچھے جو حکمتیں کام کر رہی ہیں اور جس طرح کی آزمائشیں اہلِ حق کو پیش آتی ہیں، ان کی تفصیل قرآن کے اوراق میں ہر شخص دیکھ سکتا ہے۔ یہاں میں آپ کی توجہ صرف اس امر کی طرف مبذول کرانے پر اکتفا کروں گا کہ یہ قانونِ آزمائش بدستور نافذ ہے اور آج بھی دعوت اقامتِ دین کا راستہ خارزاروں ہی سے ہو کر گذرے گا۔ اس لیے جو لوگ اس کام کے لیے آگے بڑھے ہوں ضروری ہے کہ ان کے اندر

بہت کچھ جھیل جانے کا بوتا ہو، وہ چوٹیں کھا کر اگر مسکرا نہ سکیں تو کم از کم اتنا ضرور ہو کہ کراہ کر بیٹھ بھی نہ جائیں۔ وہ اگر زمانہ کے حوادث کو حقارت سے ٹھکرا نہ سکیں تو کم از کم ایسا تو بہر حال ہو کہ اُن کے آگے سپر انداز بھی نہ ہو جائیں۔

یہ بات کسی وضاحت کی محتاج نہیں کہ انسان کے اندر یہ طاقتِ برداشت ضرور پیدا ہو کر رہتی ہے اگر وہ اپنے عہد بندگی میں مخلص ہو، جانتا ہو کہ یہ تھوڑا بہت کھونا بہت کچھ پانے کے لیے کر رہا ہے۔ اس کے شعور پر فلاحِ آخرت کی طلب پوری طرح چھائی ہوئی ہو اور سمجھتا ہو کہ اللہ کی رضا کتنی بیش قیمت چیز ہے۔

جس طرح داعی کو مصائب اور مشکلات سے ہار نہیں ماننا چاہیے اسی طرح اسے دعوت کی ظاہری ناکامیوں سے بددل اور شکستہ دل بھی نہ ہونا چاہیے بلکہ نتائج کی پروا کیے بغیر اپنے کام میں برابر لگے رہنا چاہیے۔ بلاشبہ فطرتِ بشری یہی ہے کہ آدمی اپنی کوششوں کو کامیاب دیکھ کر مزید تیز گام ہو جاتا ہے اور انہیں ناکام پا کر حوصلہ ہار بیٹھتا ہے۔ لیکن یہ بشری فطرت کا خاصہ ہے۔ ایمانی اور دعوتی فطرت کا نہیں۔ ایمانی اور دعوتی فطرت تو یہ ہے کہ انسان ظاہری کامیابیوں اور ناکامیوں سے بلند رہے، اور اللہ کے بندوں تک اس کا پیغام اعلان کے ساتھ بھی اور اسرار کے ساتھ بھی، حکمت اور موعظت کے ساتھ بھی اور جدالِ احسن کے ساتھ بھی، ہر ممکن طریقہ اور تدبیر سے برابر پہنچاتا ہی رہے۔ اگر اس کی آواز کے لیے دلوں کے دروازے نہ کھل رہے ہوں تو یہ صورتِ حال اس کے لیے بددل اور خاموش ہو رہنے کا نہیں بلکہ مزید اضطراب پیکار کا موجب بن جائے۔ وہ ہمیشہ یاد رکھے کہ اس کی دعوت جن دعوتوں کی صدائے بازگشت ہے ان کے اولوالعزم سربراہوں نے اس کے لیے یہی اُسوہ چھوڑا ہے۔ چنانچہ یہ قرآن پاک ہی کا بیان ہے کہ اللہ کے ایک پیغمبر نے سال دو سال نہیں پورے ساڑھے نو سو برس اس مجاہدے میں گزارے تھے۔ یہ مخبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا بیان ہے کہ کتنے ہی پیغمبر ایسے گزرے ہیں جن کی دعوت پر لبیک کہنے والوں کی تعداد چند سے زیادہ نہ تھی اور بعض پر ایمان لانے والے بس ایک ہی دو تھے۔ حتیٰ کہ بعض ایسے بھی تھے جو زندگی بھر لوگوں کو حق کی طرف بلاتے رہے اگرچہ ایک شخص نے بھی ان کی سن کر نہ دی۔ حضرات انبیاء کرام کی تاریخِ دعوت و عزیمت کے یہ صفحات اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھا دینے کے لیے بالکل کافی ہیں کہ حق کا داعی دعوت کی ظاہری ناکامی سے چاہے جس قدر بھی متفکر اور مضطرب ہو مگر وہ مایوس اور بددل

ہو کر خاموش بیٹھ نہیں رہتا۔ یہ اس لیے کہ دعوت کی ظاہری ناکامی، داعی کی اپنی ناکامی کی ہم معنی ہرگز نہیں ہے۔ اس کے برخلاف یہ عین ممکن ہے کہ دعوت کی سو فیصد ناکامی کے باوجود داعی اپنی اصل غایت مقصود کے لحاظ سے سو فیصد کامیاب رہے۔ کیونکہ اس کی اصل غایت مقصود لوگوں کے اندر ایمان کا اُتار دینا اور زمین کے اُوپر نظامِ حق کا قائم کر دینا نہیں ہے بلکہ اللہ رب العالمین کی خوشنودی اور آخرت کی خوش انجامی کا حاصل کر لینا ہے اور یہ وہ مقصد ہے جو ایمان کے تقاضوں اور دعوتی جدوجہد کا حق ادا کر دینے کے بعد لازماً حاصل ہو جاتا ہے خواہ اس جدوجہد کا کوئی ظاہری نتیجہ نکلے یا نہ نکلے۔ یہ ایک ایسی مسلّمہ حقیقت ہے کہ جس سے کوئی بھی صاحبِ ایمان بے خبر نہیں ہو سکتا۔ اور ایک داعی کے مایوسی اور دل شکستگی سے بچے رہنے اور پوری مستقل مزاجی سے دعوتی فرائض انجام دیتے رہنے کے لیے ضروری ہے کہ دعوت کے کارکنوں کا ذہن اس بارے میں بالکل صاف رہے۔ وہ اس یقین کے ساتھ اللہ کے بندوں کو اللہ کے دین کی طرف بلائیں اور بلاتے رہیں کہ ان کی ہر جدوجہد ایسی جدوجہد ہے جس میں نامرادی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

خلقِ خدا سے محبت چوتھا بنیادی وصف جو دعوت کا فرض انجام دینے کے لیے شرطِ لازم کی حیثیت رکھتا ہے خلقِ خدا سے گہری محبت اور اس کی سچی بہی خواہی ہے۔ محبت ان کی دنیا کی بھی، ان کی آخرت کی بھی۔ بہی خواہی ان کی یہاں کی فلاح و بہبود کے بارے میں بھی اور ان کی اُخروی نجات و کامرانی کے سلسلے میں بھی۔ داعیِ حق کو لازماً مُحبِ خلق بھی ہونا چاہیے۔ لوگوں کی دنیوی تکلیفوں، محرومیوں اور پریشانیوں کی ٹیس بھی اُسے اپنے اندر محسوس کرنی چاہیے اور ان کی آخرت کو ناکام بنا دینے والی گمراہیوں اور بداعمالیوں پر بھی بے چین رہنا چاہیے۔ صرف اس لیے نہیں کہ اس کے بغیر وہ ان کے دلوں میں اپنے لیے جگہ نہیں بنا سکتا۔ بلکہ فی الاصل اس لیے کہ یہ انسانیت کا بنیادی جوہر اور ایمان و اسلام کا فطری خاصہ ہے۔ اسلام کا کہنا یہ ہے کہ پوری نوعِ انسانی ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہے اور سارے انسان اللہ کا کنبہ ہیں۔ اس نقطۂ نگاہ سے وہ شخص فی الواقع بلا انسانیت کا انسان ہے جو دوسرے انسانوں کو اُنس و یگانگت کی نگاہ سے نہ دیکھے۔ وہ شخص اسلام و ایمان کی حقیقت یعنی خدا کی محبت سے ناآشنا ہے جس کے اندر اس کے کنبہ کی محبت نہ ہو۔ غرض حقیقی انسانیت اور حقیقی خدا پرستی دونوں ہی کا تقاضا ہے کہ مومن کے دل میں بندگانِ خدا سے محبت اور خیر خواہی کے جذبات موجزن ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قلبی کیفیت اپنے مخاطبین کے بارے میں جو تھی اُسے قرآن حکیم نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:-

"اس پر تمہارا تکلیفوں میں مبتلا ہونا بہت شاق گزرتا ہے اور وہ تمہاری بھلائی کا حریص ہے"۔

(سورۂ توبہ)

اس ارشادِ الٰہی میں "تم" سے مراد وہ لوگ ہیں جو نہ صرف یہ کہ ابھی ایمان نہیں لائے تھے بلکہ اس دعوتِ ایمان و اسلام کی برابر مخالفت کرتے آ رہے تھے۔ ایسے لوگوں کے حق میں بھی آپ کے قلبِ اطہر کے اندر غصہ اور نفرت تو درکنار کوئی بے پروائی اور بے رخی تک نہ تھی۔ اگر تھا تو بھائی چارگی کا احساس تھا، مروّت کا جذبہ تھا، محبت تھی، دلسوزی تھی، ان کی بدنصیبیوں پر کڑھن تھی۔ آپؐ سے یہ دیکھا نہ جاتا تھا کہ لوگ اُن راستوں پر چلے جا رہے ہیں جو انہیں ہر طرح کی ناکامیوں کے کھڈ میں گرا دینے والا ہے اور اس بات کے صدقِ دل سے کوشاں اور آرزومند رہا کرتے تھے کہ لوگ اس راہ پر آ جائیں جو انہیں دنیا و آخرت دونوں کی سعادتوں سے ہمکنار کرنے والی ہے۔ اس سلسلے میں آپ کے اندر جو جان گھلا دینے والی بے قراری تھی اس کا حال قرآن مجید نے یہ بتایا ہے :۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ اپنے آپ کو اُن کے پیچھے غم کے مارے ہلاک کر دیں گے اگر یہ لوگ اس قرآن پر ایمان نہ لائے"۔ (کہف)

اگر کسی شخص کے سامنے اللہ کے پیغمبر کا یہ اسوہ نہیں ہے اور وہ خلقِ خدا کی مصیبتوں پر پریشان ہونا نہیں جانتا اور اس کے لیے خیر و فلاح کا حریص نہیں ہے تو وہ دعوتِ حق کا کام صحیح معنوں میں ہرگز انجام نہیں دے سکتا۔

قول اور عمل کی یکسانی

پانچواں بنیادی وصف جسے دعوت کے کارکنوں میں لازماً موجود ہونا چاہیے، قول و عمل کی یکسانی ہے۔ ضروری ہے کہ جو اُن کی دعوت ہو وہی ان کی زندگی بھی ہو۔ وہ زبان سے جس حق کی طرف لوگوں کو بلا رہے ہوں، اس کی صداقت اور حقانیت پر اپنے کردار کی شہادت بھی پیش کر رہے ہوں۔ اُن پر یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو کہ جس دعوت کو وہ لے کر اٹھے ہیں اس کے اوّلین مخاطب وہ خود ہیں۔ دین کی جس اقامت کو وہ اپنا واحد فریضۂ حیات قرار دیتے ہیں اس کی کامیاب ابتدا اگر ہو سکتی ہے تو ان کی اپنی ذات سے ہو سکتی ہے۔ اللہ کا دین پہلے اس کی دعوت دینے والوں کے دلوں پر، اُن کے اخلاق و کردار پر، اور ان کے جذبات و میلانات پر قائم ہوتا ہے۔ تب کہیں جا کر باہر کی دنیا کی تسخیر کا امکان پیدا ہوتا ہے۔ دعوت بلا عمل نہ صرف یہ کہ دوسروں کو متاثر نہیں کر سکتی بلکہ خود اپنے خلاف دلیل بن جاتی ہے۔

داعی اپنی بے کرداری، سیرت کی خامی اور قول و عمل کے تضاد کو لوگوں کے سامنے دیوار بنا کر کھڑی کر دیتا ہے کیونکہ دنیا بالعموم کسی دعوت کو اس کے علمبرداروں کی زبان سے نہیں بلکہ ان کے عمل سے سمجھا کرتی ہے۔ بڑے بڑے دعووں، مسحور کن تقریروں اور حسین و بلیغ تحریروں کے سامنے نہیں بلکہ ذوقِ یقین، حُسنِ خلق اور پاکیزگیٔ عمل ہی کے سامنے جھکا کرتی ہے۔ پس دعوت کا اپنے کارکنوں پر سب سے بڑا حق یہ ہے کہ ان کا عملی رویّہ بھی لازماً اس کی صداقت کی گواہی دیتا رہے۔ لوگ چاہے اس کی بات نہ مانیں مگر نہ ماننے کا سبب وہ خود ہرگز نہ بنیں۔ اس بارے میں ان کے سامنے معیارِ مطلوب یہ ہو کہ مخالف سے مخالف بھی داعی کی حُسنِ نیت اور حُسنِ سیرت کا انکار نہ کر سکے۔ اور دعوت کو رد بھی کرے تو اس اعتراف کے ساتھ رد کرے کہ ہم تمہاری دعوت کو رد کرتے ہیں، تمہیں نہیں رد کرتے۔

طریقۂ کار کی پاکیزگی چھٹی صفت طریقۂ کار کی پاکیزگی ہے۔ دعوتِ اسلامی کے کارکنوں کو برابر ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ دین کی اقامت کا کام جس طرح دنیا کا سب سے بڑا کام ہے اسی طرح سب سے پاکیزہ کام بھی ہے۔ دین کی اقامت کے معنی دنیا کو بھلائیوں سے آراستہ کر دینے کے ہیں۔ بھلائی کا کام جس طرح بُرے لوگوں کے ہاتھوں ممکن نہیں ہے اسی طرح بُرے طور طریقوں سے بھی ممکن نہیں ہے۔ خیر کو جب بھی فروغ حاصل ہوگا اور شر سے دنیا جب بھی پاک ہوگی پاکیزہ طریقوں سے ہی ہوگی۔ گندگی کو گندگی سے پاک نہیں کیا جا سکتا۔ دین کی اقامت کے پاکیزہ مقصد کے لیے ناپسندیدہ طریقے اگر اختیار کیے گئے تو وہ اُلٹے خود اس کے تقدس کو مجروح کر کے رکھ دیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ حکیم نے اس نکتہ پر بار بار زور دیا ہے کہ بُرائی بہر حال بُرائی ہے وہ کسی حسنِ نیت یا کسی دینی مصلحت کے نام پر بھلائی نہیں بن سکتی۔ ولا تستوی الحسنۃ ولا السیئۃ۔ اور ہدایت دی ہے کہ بُرائی کا ازالہ بھلے سے بھلے طریقے سے کرو۔ ادفع بالتی ھی احسن۔ پس کسی بھی داعی اسلام کو غلط طریقوں کی بابت سوچنا بھی نہیں چاہیے چاہے بظاہر اس کا کتنا ہی فائدہ نظر آتا ہو کیونکہ یہ فائدہ دعوت کے حق میں دراصل باعتبارِ انجام بہت بڑا نقصان ہوگا۔

سچی خدا پرستی آخر میں اس صفت کو لیجیے جو ساری صفات میں اوّلین مقام رکھتی ہے۔ یہ صفت اللہ تعالیٰ کی سچی اطاعت گذاری اور رضا طلبی کی صفت ہے۔ دعوت کا کام سرتا سر اللہ کا کام ہے۔ وہی اس کا مبدا بھی ہے اور وہی اس کا مرجع بھی۔ جو کام اللہ کے لیے ہو اس کی انجام دہی اسی وقت ممکن ہے جب

آدمی خود اللہ کا ہو جائے اور اس کی ساری آرزوئیں اسی کی رضا کی آرزو میں گم ہو گئی ہوں۔ یہ ایک صاف اور سیدھی سی حقیقت ہے جس سے کوئی بھی ایسا شخص ناواقف نہیں ہو سکتا جو اسلام سے واقف ہو۔ پس کوئی شبہ نہیں کہ دعوت کا کام انجام دینے کے لیے جو چیز بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے وہ یہی سچی خدا پرستی اور خدا کی سچی رضا طلبی ہے۔ یہی وہ خاص وصف ہے جو کسی تحریک کو اسلامی تحریک اور اس کے کارکن کو اسلامی تحریک کا کارکن بناتا ہے۔ یہی وہ خاص وصف ہے جو اسلامی اور غیر اسلامی تحریکات میں جوہری امتیاز پیدا کرتا ہے۔ یہی وہ خاص وصف ہے جو انسان کو بدی اور غفلت کی ظلمتوں سے نکال کر نورِ حق کی طرف لے جاتا اور اس کی نگاہوں کو بھٹکنے سے بچاتا ہے۔ یہی وہ خاص وصف ہے جو دعوت کے کارکنوں کو اپنے مشن کا سچا وفادار بنائے رکھتا ہے اور یہی وہ خاص وصف ہے جو دعوت اور اہل دعوت کو اللہ کی نُصرتوں کا سزاوار بناتا ہے۔ اس وصف سے محروم ہو جانے کے بعد آدمی دعوتِ حق کے کسی کام کا نہیں رہ جاتا خواہ وہ بظاہر عظمت اور مقبولیت کی چوٹیوں ہی پر بیٹھا نظر آتا ہو۔ غرض یہ ایسی صفت ہے جو دعوت اسلامی کی روح کی حیثیت رکھتی ہے جسے دراصل اُمّ الصفات کہنا چاہیے۔ سچی خدا پرستی اور للّٰہیت کی صفت کا پیدا ہو جانا فی الواقع ایک طرف تو ساری ایمانی اور دعوتی صفات کی شاہ کلید کا ہاتھ آ جانا ہے، دوسری طرف اُن اخلاقی نجاستوں سے اپنے آپ کو پاک رکھنے کا نسخۂ کیمیا بھی پالینا ہے جو آدمی کو دعوت ہی نہیں انسانیت کے مقام سے بھی گرا دیتی ہیں۔ جس شخص کے اندر بندگی کا اخلاص، آخرت کی بازپرس کا خوف اور اللہ کی خوشنودی کی طلب رچی بسی ہو گی وہ دعوت کا علمبردار ہوتے ہوئے فخر و غرور، نمود و نمائش، تعلی اور خود ستائی، ریا، خود پرستی اور خود رائی کی اُن بیماریوں سے نہ خود گھن کھائے گا جو تحریکوں کے لیڈروں اور کارکنوں میں عام طور سے پیدا ہو جایا کرتی ہیں۔ اپنے فرض کا احساس اور اپنے انجام کی فکر اسے اپنے نفس کا ایسا محتسب بنائے رکھے گی جو اسے اس طرح کی کسی اخلاقی بیماری کے قریب نہ جانے دے گا۔ خود احتسابی کے بغیر کوئی بھی شخص ایمان کے مطالبات اور دعوت کے تقاضے پورے نہیں کر سکتا اور یہ خود احتسابی انسان کو میسر نہیں آ سکتی اگر اس کا رشتہ اپنے معبود سے مضبوط نہ ہو۔ اس لیے دعوت کے کارکنوں کو ایک لمحہ کے لیے اپنے عبدیت کے سچے احساس اور اپنے آقا و مولیٰ کی رضا جوئی سے غافل نہ رہنا چاہیے۔

یہ ہیں وہ اعلیٰ بنیادی صفات جو کسی بندۂ خدا کے اندر جمع ہو جاتی ہیں تو وہ صحیح معنوں میں حق کا داعی اور تحریک اقامت دین کا رکن بن جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اپنے تمام بندوں کو اپنے دین کی سچی خدمت کا جذبہ اور اس کی نصرت و اقامت کی صحیح توفیق عطا فرمائے۔ ربنا لا تزغ قلوبنا بعد اذ هديتنا وهب لنا من لدنك رحمة انك انت الوهاب۔